Fikr-e-Iqbal
Vol 2 No 1, 2025

Muslim Society and the Concept of Ijtihad

مسلم سماج اور تصورِ اجتہاد: علامہ اقبال اور سید مودودی کی علمی بصیرتوں کا تقابلی مطالعہ

Halah Ameena Ali
Research Scholar PhD (Urdu)-International Islamic University, Islamabad
Correspondence: hajra.phdurd95@iiu.edu.pk

Abstract

This research article, entitled "Muslim Society and the Concept of Ijtihad: A Comparative Study of the Intellectual Insights of Allama Iqbal and Syed Maududi", undertakes an exploration of the role of ijtihad in shaping the contours of modern Muslim thoughts and practices. It focuses particularly on the comparative perspectives of two influential twentieth-century Muslim thinkers: Allama Muhammad Iqbal and Syed Abul A'la Maududi. The central aim of this study is to analyse how both scholars conceptualized ijtihad as a dynamic and vital principle of Islamic law and society, and to evaluate their respective contributions to the revival of Muslim intellectual life in the modern era.

Methodologically, the research adopts a qualitative, analytical, and comparative approach. It draws upon primary sources such as Iqbal's The Reconstruction of Religious Thought in Islam and Maududi's Khilafat o Malookiat, Tarjumaan-ul Quran and Tafheem-ul Quran, supplemented by secondary resources like scholarly works and journal articles. Employing a comparative framework, the study analyses their approaches with reference to three dimensions: philosophical orientation, institutional models, and the practical applicability of ijtihad within contemporary Muslim societies.

The key findings reveal that for Allama Iqbal, ijtihad is envisioned as a creative and philosophical enterprise, indispensable for the intellectual rejuvenation of Muslim society, and he advocated its institutionalisation through democratic mechanisms such as the parliament. Syed Maududi, by contrast, understood ijtihad as a systematic, jurisprudential, and institutional process to be carried out by a council of qualified scholars under the supremacy of the Qur'an and Sunnah. Both thinkers rejected the notion of blind imitation (taqlid) and consistently highlighted ijtihad as the lifeblood of Islamic vitality.

The study concludes that Iqbal embodies the spirit of ijtihad, whereas Maududi provides its structural framework. Taken together, their intellectual legacy offers a balanced and comprehensive model for addressing the complex challenges facing Muslim societies in the contemporary era.

Keywords:
Allama Muhammad Iqbal, Syed Abul A'la Maududi, Ijtihad, Islamic Law, Comparative Study

Fikr-e-Iqbal
Vol 2 No 1, 2025
فکرِ اقبال
Received: 25-10-2025 **Accepted:** 01-12-2025 **Online:** 31-12-2025

Licensed under CC BY-NC 4.0 (Non-Commercial, Attribution).
2025 [Author]. All rights reserved.

مسلم فکری روایت میں "اجتہاد" ایک بنیادی اور ہمہ گیر تصور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اجتہاد کا لفظی مفہوم کوشش اور محنت ہے جب کہ اصطلاحی مفہوم نصوص و اصولِ شریعہ کو مد نظر رکھ کر نئے حالات اور مسائل کے بارے میں عقلی و دینی بصیرت کے ساتھ تحصیلِ رہ نمائی ہے(۱)،یعنی اجتہاد "نئے پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں دین کا رویہ یا نقطۂ نگاہ دریافت کرنے کا نام ہے۔"(۲) اسلامی تاریخ میں اجتہاد کا عمل محض فقہی جزئیات تک محدود نہیں رہا بل کہ اس نے سیاسی، سماجی اور تہذیبی دائروں میں بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی مسلم سماج کسی فکری جمود یا عملی بحران سے دوچار ہوا، تو تجدید فکر و اجتہاد کی آوازیں بلند ہوئیں۔

اسلامی شریعت کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے جو قرآن و سنت کی صورت میں محفوظ ہے۔ تاہم، دورِ نبوی ﷺ میں ہی کچھ ایسے مسائل بھی سامنے آنے لگے جن کے بارے میں براہِ راست نصوص موجود نہ تھیں۔ یہی وہ مقام تھا جہاں اجتہاد کی ضرورت سامنے آئی۔ مسلم سماج میں اجتہاد کی اہمیت یوں بھی مسلّم ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے قرآن و سنت سے براہِ راست رہ نمائی کے ساتھ ساتھ ایک ایسا فکری منہاج بھی عطا کیا ہے جس کے ذریعے امت پیش آیندہ حالات اور ضروریات کے مطابق فیصلے کر سکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو بہ طور عامل یمن بھیجتے وقت ان سے استفسار کیا کہ "معاملات کے فیصلے کیسے کرو گے؟" تو انھوں نے عرض کی: "کتاب اللہ کی بنیاد پر۔" حضورؐ نے مزید پوچھا: "اگر کتاب اللہ میں کسی معاملے کا فیصلہ نہ پاؤ، تو؟" عرض کیا: "سنتِ رسول اللہؐ کی بنیاد پر۔" فرمایا: "اگر سنت بھی ناکافی ٹھہری، تو؟" تو معاذؓ نے جواب دیا: "میں اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا اور کوتاہی نہیں کروں گا۔"(۳) یہ واقعہ اجتہاد کی اساس کو واضح کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، غزوۂ بدر میں قیدیوں کے ساتھ برتاؤ، تیمم کی اجازت، یا مختلف سیاسی اور عسکری تدابیر اجتہاد کے ابتدائی نمونے ہیں۔ دورِ خلافت میں ہمیں اجتہاد کی بیش تر امثال ملتی ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد میں متعدد اجتہادی فیصلے کیے، مثلاً مفتوحہ اراضی کو تقسیم نہ کرنا بل کہ بیت المال کی ملکیت قرار دینا، یا قحط کے زمانے میں چوری کی حد نہ لگانا۔ یہ سب فیصلے اس امر کا ثبوت ہیں کہ اجتہاد کو حالات کے تقاضوں کے مطابق بروئے کار لایا جاتا تھا۔

ابتدائی اسلامی عہد میں اجتہاد ایک زندہ اور فعال عمل تھا۔ خلفائے راشدینؓ نے اپنی حکمرانی کے دوران اجتہاد سے کام لے کر نئے مسائل کا حل فراہم کیا۔ بعد ازاں ائمہ مجتہدین—امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ—نے اپنے

اپنے اصولی مناہج وضع کیے اور اجتہاد کو فقہی مکاتبِ فکر کی بنیاد بنایا۔ دوسری صدی ہجری تک اجتہاد ایک منظم علمی طریق کار کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ نے قیاس، استحسان اور عرف جیسے اصول متعارف کروائے۔ امام مالکؒ نے اہلِ مدینہ کے تعامل کو حجت قرار دیا۔ امام شافعیؒ نے "کتاب الرسالہ" میں اصولِ فقہ کی بنیاد رکھی اور اجتہاد کے مناہج کو مربوط کیا۔ امام احمد بن حنبلؒ نے نصوص پر زیادہ زور دیا لیکن اجتہاد کی گنجائش کو برقرار رکھا۔ ان ائمہ کی علمی کاوشوں کے نتیجے میں مختلف فقہی مکاتب وجود میں آئے جنھوں نے بدلتے حالات میں مسلمانوں کو عملی رہ نمائی فراہم کی۔ اجتہاد اس زمانے میں نہ صرف فقہی مسائل بل کہ عدالتی فیصلوں اور حکومتی پالیسیوں کے لیے بھی مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد مسلم علمی دنیا میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ "بابِ اجتہاد" بند ہو چکا ہے۔ اس تصور کے کئی فکری و عملی اسباب تھے جن میں فقہی مکاتبِ فکر کا استحکام اور مقلدین کی کثرت، علمی مراکز میں مناظرانہ روش اور جمود، اور سیاسی انتشار اور مسلم ریاستوں کی کم زوری نمایاں تر ہیں۔ نتیجتاً، اجتہاد کی بجائے "تقلید" کا رجحان غالب آ گیا۔ نئے علما نے قدیم آرا کو دہرانے پر اکتفا کیا اور اجتہاد معدوم ہونا شروع ہو گیا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ اجتہاد بالکل ختم ہو گیا تھا؛ مختلف ادوار میں مخصوص علما نے اجتہاد کے دروازے کھولے رکھے، جیسے ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے اپنے زمانے میں بہت سے اجتہادی فیصلے دیے مگر بہ طور مجموع مجتہدانہ عمل جامد ہو گیا۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں جب مغربی تہذیب اور نو آبادیاتی استعمار نے مسلم دنیا پر اپنے اثرات مرتب کیے تو اجتہاد کی ضرورت نئے انداز سے محسوس کی گئی۔ تعلیم، معیشت، سیاست، سائنس اور ٹیکنالوجی ایسے شعبوں میں مغربی اداروں کے دخول اور ان سے پیدا شدہ نئے قوانین اور نئے مسائل نے علما و فقہا کو اجتہاد کے تصور کو از سرِ نو زندہ کرنے کی تحریک دی۔ لہٰذا، مسلم مفکرین نے اجتہاد کو صرف فقہی نہیں بل کہ ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی بقا کا ذریعہ سمجھا۔ ان کے نزدیک اجتہاد ہی کے ذریعے روحِ اسلام کو محفوظ رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے چیلنجز کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ سید احمد خان نے مذہبی فکر کی نئی تعبیر کی بات کی، جمال الدین افغانی نے اجتہاد کو سیاسی احیا کا ذریعہ سمجھا، اور محمد عبدہٗ نے فقہی احیائے نو کی بات کی۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ کی فکر نے اس بحث کو مہمیز دی۔ ان کے نزدیک اجتہاد ایک مسلسل عمل ہے جس کے بغیر امت اپنی بقا قائم نہیں رکھ سکتی۔

آج کے مسلم سماج کو درپیش مسائل—جمہوریت اور خلافت کے مابین تعلق، جدید معیشت اور اسلامی اصولوں کی مطابقت، سائنس و ٹیکنالوجی کے نئے مسائل (جیسے بائیو ٹیکنالوجی، انٹرنیٹ، مصنوعی ذہانت)، خواتین کے حقوق، ماحولیاتی بحران، اور عالمی سیاست میں مسلم دنیا کی حیثیت—سب ایسے امور ہیں جو اجتہاد کے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ تقلید اور جمود کی کیفیت میں

مسلم سماج معاصر دنیا کے ساتھ ہم قدم نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مسلم مفکرین کے نزدیک اجتہاد محض فقہی احتیاج نہیں بل کہ مسلم سماج کی بقا کا مسئلہ ہے۔

تاریخ میں اجتہاد زیادہ تر انفرادی علما کے ذریعے ہوتا رہا ہے لیکن مذاہبِ اربعہ کے قیام کے بعد مسلم علما و فقہا علمی و عملی تقلید کی طرف مائل ہوئے جس باعث اجتہادِ نو کا سلسلہ اور بالخصوص انفرادی سطح پر سلسلۂ اجتہاد یک سر رک گیا۔ لیکن جدید مسلم مفکرین کا اتفاق ہے کہ اجتہاد اب ایک اجتماعی اور ادارہ جاتی عمل ہونا چاہیے۔ جدید ریاستوں میں پارلیمنٹ، اسلامی نظریاتی کونسلز اور فقہی اکیڈمیاں اس کی عملی صورت ہیں۔ اسی تناظر میں برصغیر کے دو بڑے مفکرین، علامہ محمد اقبال اور علامہ سید ابو الاعلا مودودی، نے اجتہاد پر نہ صرف بحث کی بل کہ اپنے اپنے زاویہ فکر سے اس کی وضاحت بھی کی۔ اقبال نے اپنے فلسفیانہ اور شعری اسلوب میں اجتہاد کو اسلامی فکر کی تجدید اور مسلم سماج کی بیداری کے لیے لازم قرار دیا۔ انھوں نے اپنی کتاب تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ (The Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں اجتہاد کی عصری معنویت کو واضح کیا۔ ان کے نزدیک اجتہاد ایک ایسا اجتماعی اور ادارہ جاتی عمل ہے جو جدید ریاستی ڈھانچے میں پارلیمنٹ کے ذریعے انجام دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ قرآن و سنت کی رہ نمائی میں کام کرے۔ کہتے ہیں کہ "فقہ اسلامی کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے وہ کوشش جو کسی قانونی مسئلے میں آزادانہ رائے قایم کرنے کے لیے کی جائے اور جس کی بنا جیسا کہ میں سمجھتا ہوں شاید قرآن مجید کی اس آیت 'الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا' پر ہے۔"(۴)

دوسری طرف سید مودودی نے اپنے فقہی اور علمی و عملی اسلوب میں اجتہاد کی تفہیم و ترسیل قرآن و سنت کی براہِ راست بالادستی کے تحت کی۔ ان کے نزدیک اجتہاد کی اساس نصوصِ شریعت سے گہرا ربط ہے اور یہ عمل اہلِ حل و عقد یا منتخب علما و فقہا پر مشتمل ادارے کے ذریعے ہونا چاہیے۔ سید مودودی نے اجتہاد کو محض انفرادی یا فقہی عمل کے طور پر نہیں دیکھا بل کہ اسے اسلام کے ہمہ گیر نظامِ حیات کا حصہ قرار دیا۔ ان کی تصانیف تفہیم القرآن، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی اور خلافت و ملوکیت میں اجتہاد کا یہی نقطۂ نظر ملتا ہے۔

اقبال نے اجتہاد کو فلسفیانہ اور جدید ریاستی تناظر میں پیش کیا جب کہ مودودی نے اسے فقہی اور ادارہ جاتی دائرے میں رکھا۔ یہ فرق نہ صرف ان کی فکری اساس کی نمائندگی کرتا ہے بل کہ مسلم سماج کے لیے دو مختلف اجتہادی ماڈلز بھی فراہم کرتا ہے۔

تاریخی جائزہ یہ واضح کرتا ہے کہ اجتہاد محض فقہی ضرورت نہیں بلکہ اسلامی تہذیب کی بقا اور ترقی کا بنیادی اصول ہے۔ ابتدائی دور میں یہ ایک زندہ روایت تھی جس نے مسلم سماج کو حالات کے ساتھ ہم آہنگ رکھا۔ بعد ازاں حالاتِ پیش آیندہ کے تقاضوں کا ادراک کیے بغیر اسلاف کی تقلیدِ محض کے باعث اجتہادی سلسلہ جامد ہو گیا تو امت فکری و عملی بحران میں مبتلا ہوئی۔ جدید دور کے نئے چیلنجز میں مسلم سماج کی بقا اور احیائے دین کے لیے اجتہاد کی نئی معنویت اور ناگزیریت سامنے آئی۔ یہی پس منظر ہمیں علامہ اقبال اور سید مودودی کے تصورِ اجتہاد کی تفہیم میں معاونت کرتا ہے۔ دونوں مفکرین نے اپنے اپنے زاویہ فکر سے اجتہاد کی عصری ضرورت کو اجاگر کیا، اور یہی اس مقالے کے تقابلی مطالعے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷–۱۹۳۸ء) برصغیر کے ان چند مفکرین میں شامل ہیں جنھوں نے نہ صرف مسلم سماج کی فکری کم زوریوں کی تشخیص کی بل کہ ان کے علاج کے لیے ایک مربوط نظریاتی خاکہ بھی پیش کیا۔ اقبال کا فلسفۂ خودی، تصورِ عمل اور دین کی تجدیدی فکر دراصل مسلم معاشرت کو جمود اور غلامی سے نکالنے کی کوشش ہے۔ اجتہاد کے حوالے سے اقبال کی بصیرت اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ وہ اسلام کو ایک زندہ اور ہمہ گیر نظام کے طور پر دیکھتے تھے جو ہر دور کے مسائل کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اقبال کا تصورِ اجتہاد ان کی کتاب تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (The Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری بھی اجتہاد اور تجدیدِ فکر کی دعوت سے لبریز ہے۔

اقبال کے نزدیک کائنات جامد نہیں بلکہ مسلسل حرکت میں ہے۔(۵) قرآن نے انسان کو "خلیفۃ اللہ فی الارض" قرار دیا ہے اور یہ خلافت تب ہی ممکن ہے جب انسان اپنی عقل، بصیرت اور اجتہادی صلاحیت کو بروئے کار لائے۔ اقبال کے فلسفۂ خودی کا بنیادی نکتہ بھی یہی ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو بیدار کرے اور اپنے گرد و پیش کے حالات پر قابو پانے کے لیے فعال کردار ادا کرے۔ اقبال کے نزدیک اجتہاد محض فقہی ضرورت نہیں بلکہ ایک تہذیبی و تخلیقی عمل ہے۔ وہ اجتہاد کو زندگی کے ارتقائی اصول کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو قومیں اجتہاد ترک کر دیتی ہیں، وہ جمود، تقلید اور زوال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اقبال نے اپنے چھٹے خطبے "اجتہاد فی الاسلام" (The Principle of Movement in the Structure of Islam) میں اجتہاد پر جامع بحث کی۔ اقبال کے مطابق اسلام کی بنیاد توحیدِ ذاتِ الٰہیہ ہے اور ذاتِ الٰہیہ درحقیقت روحانی اساسِ حیات ہے اور اطاعتِ الٰہی دراصل اطاعتِ فطرتِ صحیحہ ہے۔ لکھتے ہیں:

"اسلام کے نزدیک حیات کی یہ روحانی اساس ایک قایم و دایم وجود ہے جسے ہم اختلاف و تغیر میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔ اب اگر کوئی معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔ اس کے پاس کچھ تو ایسے دوامی اصول ہونے چاہییں جو حیاتِ اجتماعیہ میں نظم و انضباط قایم رکھیں۔۔۔ اسلام کی ہیتِ ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیر قایم رکھتا ہے؟ اس کا جواب ہے، اجتہاد!"

اقبال کے نزدیک قرآن ایک زندہ کتاب ہے جو انسان کو فکر و تدبیر اور حالاتِ نو کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اقبال خود قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ ﷺ کو اثباتِ اجتہاد کے لیے بُرہانِ صریح مانتے اور پیش کرتے ہیں۔ مسلم سماج میں اجتہاد ہی وہ راستا ہے جس کے ذریعے اسلامی شریعت کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ رکھا جا سکتا ہے۔ اقبال نے اجتہاد کو "قانونِ اسلام کی تشکیلِ جدید" قرار دیا اور کہا کہ امت کو چاہیے کہ وہ اجتہاد کے راستے کو از سرِ نو کھولے۔ ان کے نزدیک "بابِ اجتہاد" کے بند ہونے کا تصور اسلامی فہم و فکر کے لیے سمِ قاتل تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک زندہ اور متحرک مذہب ہے؛ اس کی بقا اسی میں ہے کہ اس کی تعبیر ہر دور میں پیش آیندہ معاملات و حالات کے مطابق قرآن و سنت، اجماع و قیاس اور استحسان کو مد نظر رکھ کر نئے سرے سے کی جائے۔

اقبال کا سب سے نمایاں تصور یہ ہے کہ اجتہاد کو جدید ریاستی اداروں کے ذریعے اجتماعی شکل میں انجام دیا جانا چاہیے۔ ان کے نزدیک جدید جمہوری ریاست میں پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق حاصل ہونا چاہیے، بشرطیکہ وہ قرآن و سنت کی بالادستی کو تسلیم کرے۔ یہ تصور دراصل اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اقبال اجتہاد کو محض علما کی علمی محفل تک محدود نہیں دیکھتے تھے بل کہ اسے ایک قومی و ریاستی ذمہ داری قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ کو علما، ماہرینِ قانون اور معاشرتی نمائندوں کے اشتراک سے نئے پیش آیندہ چیلنجز کے حل تلاش کرنے چاہییں۔

اقبال مغربی فکر سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے ہیگل، نطشے، برگساں اور کانٹ جیسے فلسفیوں کے خیالات کا مطالعہ کیا اور ان کے مثبت پہلوؤں کو اسلامی فکر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ہارٹن کے مطابق "مسلمانوں نے اپنے گرد و پیش کی ثقافتوں اور تہذیبوں سے جو عناصر لیے ان کو ہمیشہ اپنے مذہبی مطمحِ نظر میں ڈھال کر اپنی ثقافت میں جذب کیا۔" تاہم، اقبال مغربی تہذیب کے اس پہلو کے ناقد تھے جس نے انسان کو خدا سے کاٹ کر مادیت پرستی کو بنیاد بنایا۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کو اپنی تہذیبی و مذہبی اور دینی شناخت کو قربان کیے بغیر مغرب کی سائنسی ترقی سے نہ صرف استفادہ کرنا چاہیے بل کہ

کائنات پر فکر و تدبر کے ذریعے مزید اوج و عروج کی تحصیل کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ اجتہاد کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان نئے علوم و افکار کو اسلامی اصولوں کے دائرے میں جذب کریں۔

اقبال کے نزدیک اجتہاد فطرتِ حیات و کائنات کے عین مطابق ایک ارتقائی عمل ہے۔ وہ اس کو فقہی روایت کی تکرار کے بجائے براہِ راست قرآن کی روشنی میں ایک آزاد عمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ نیز، وہ اجتہاد کو فرد کے بجائے پارلیمنٹ اور ریاست کے اداروں کے سپرد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اجتہاد عمیق علمی و تحقیقی تجزیے سے جدید فکریات و نظریات سے مفید عناصر اخذ کر سکتا ہے۔ ان کے مطابق اجتہاد صرف قانونی یا فقہی معاملہ نہیں بلکہ دین کی ہمہ گیر تجدید کا اہم اور واحد ذریعہ ہے۔

علامہ اقبال کا تصورِ اجتہاد ایک ہمہ گیر اور تخلیقی تصور ہے جو مسلم معاشرے کو جمود سے نکالنے اور عصری دنیا کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کے نزدیک اجتہاد کا مقصد تغیرِ روحِ اسلام نہیں بل کہ روحِ اسلام کو معاملاتِ نو میں عملی صورت دینا ہے۔ اقبال نے اجتہاد کو مسلم سماج کی فکری و تہذیبی بقا کے لیے لازم قرار دیا اور اس کے لیے ادارہ جاتی اور اجتماعی طریق کار تجویز کیا۔ یہ تصور آگے چل کر علامہ مودودی جیسے مفکرین پر بھی اثر انداز ہوا، تاہم مودودی نے اجتہاد کو ایک مختلف زاویہ فکر سے پیش کیا۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے ہمیں اب مودودی کے اجتہادی نظریات کی تفہیم کرتے ہیں۔

سید ابو الاعلا مودودی (۱۹۰۳–۱۹۷۹ء) بیسویں صدی کے اُن نمایاں مفکرین اور مجتہدین میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اسلام کو محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں بل کہ ہمہ گیر نظامِ حیات کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے اجتہاد کو اسی ہمہ گیری کے تناظر میں دیکھا اور اس کو مسلم معاشرت کے لیے حیاتیاتی ضرورت قرار دیا۔ جہاں اقبال نے اجتہاد کو فلسفیانہ اور فکری تناظر میں اجاگر کیا وہاں مودودی نے اسے ایک عملی اور فقہی ادارہ جاتی نظام کے طور پر پیش کیا۔

سید مودودی کے نزدیک اسلام ایک مکمل ضابطِ حیات ہے جس میں انفرادی اخلاقیات سے لے کر ریاستی قوانین تک ہر پہلو شامل ہے۔ ان کے نزدیک قرآن و سنت اس ضابطے کی بنیاد ہیں لیکن تغیرِ حالات کے ساتھ اکثر متنوع مسائل سامنے آتے ہیں جن کے حل کے لیے کسی نئے اصول کی احتیاج ہوتی ہے، انھی اساسی اصولوں کو مد نظر رکھ کر پیش آیندہ معاملات کے تقاضوں کے مطابق اجتہاد ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اجتہاد ایک مسلسل عمل ہے جس کے بغیر اسلامی نظام جامد ہو جاتا ہے۔ اجتہاد دراصل وہ راستا ہے جس کے ذریعے اصول ہائے شریعہ کو تغیرِ معاملات پر منطبق کیا جاتا ہے۔ تاہم سید مودودی نے اس بات پر زور دیا کہ اجتہاد کسی بھی حال میں قرآن و سنت کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

اقبال کی طرح سید مودودی بھی تقلیدِ جامد کے سخت ناقد تھے۔ ان کا تصورِ اجتہاد سب سے پہلے مسلم سماج کے فکری و عملی جمود پر ہی ضرب لگاتا ہے۔ ان کے نزدیک مغربی ترقی سے مرعوبیت اور مثبت و منفی تمام پہلوؤں کا انجذاب بھی دراصل اسی جمود کا شاخسانہ ہے۔ لکھتے ہیں کہ

> "ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ مغربی استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا گیا تھا' اس لیے مسلمانوں کی نئی نسلوں نے شدت کے ساتھ مغربی افکار اور سائنٹی فک نظریات کا اثر قبول کیا۔ ان کی ذہنیتیں مغربی سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔ ان کے دلوں میں مغربی تہذیب کا نفوذ بڑھتا چلا گیا۔ ان میں وہ ناقدانہ نظر پیدا ہی نہیں ہوئی جس سے وہ صحیح اور غلط کو پرکھتے اور صرف صحیح کو اختیار کرتے۔ اور ان میں یہ صلاحیت ہی پیدا نہ ہو سکی کہ آزادی اور استقلال کے ساتھ غور و فکر کرتے اور اپنے ذاتی اجتہاد سے کوئی راے قائم کرتے' اسی کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلامی تہذیب جن بنیادوں پر قایم ہے وہ متزلزل ہو گئی ہیں۔ ذہنیتوں کا وہ سانچا ہی بگڑ گیا ہے جس سے اسلامی طریق پر سوچا اور سمجھا جا سکتا تھا۔"(۷)

ان کے نزدیک فقہی مکاتب کی خدمات اپنی جگہ مسلّم ہیں لیکن ان کی آرا کو غیر متبدل اور ابدی سمجھ لینا درست نہیں۔ وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ نئے معاملات کے لیے فقہی مکاتب کے علوم اور تحقیق سے استفادہ کرتے ہوئے تحقیقات و علومِ نو کے ذریعے نئی تعبیرات اور فیصلے ضروری ہیں۔ ان کے مطابق اسلام کی اصل روح اجتہاد ہے۔ اگر امت اس کو ترک کر دے تو وہ محض تقلید کے کھوکھلے خول میں بند ہو کر جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔

علامہ مودودی کا سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اجتہاد کو انفرادی کاوش کی بجائے ادارہ جاتی عمل ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک اجتہاد کے لیے اہلِ حل و عقد پر مشتمل ایک ادارہ قائم ہونا چاہیے جس میں علما، فقہا، ماہرینِ قانون، سائنس دان، معیشت دان اور دیگر شعبہ جات کے ماہرین شامل ہوں۔ اس ادارے کی ذمہ داری ہو کہ وہ قرآن و سنت کے اصول و قواعد کو مد نظر رکھ کر اجتہادی عمل سے پیش آیندہ معاصر مسائل کے حل پیش کرے۔ نیز، اجتہاد محض فقہا تک محدود نہ رہے بل کہ مختلف علوم کے ماہرین کے اشتراک سے انجام پائے۔ یہ نکتہ انھیں اقبال سے ممتاز کرتا ہے۔ اقبال اجتہاد کو پارلیمنٹ کے سپرد کرتے تھے، جب کہ سید مودودی اسے ایک منتخب "مجلسِ اجتہاد" کے حوالے کرنے کے قائل تھے۔ سید مودودی کے مطابق چوں کہ اجتہاد کا مقصد انسانی قانون بنانا یا خدائی قانون کو انسان کے قانون سے بدلنا ہر گز نہیں ہے، بل کہ اس کی درست تفہیم میں اسلامی قوانین کو رفتارِ زمانہ کے ساتھ متحرک کرنا ہے اس لیے صحت مندانہ اجتہاد کے لیے وہ مجتہد میں چند اوصاف ہونے کے قائل ہیں کہ مجتہد

شریعتِ الٰہیہ (قرآن و سنت) پر ایمان و ایقان رکھتا ہو اور اجتہاد کے لیے اولین مآخذ کے طور پر انھی سے استفادہ کرے۔ عربی زبان، اس کے قواعد و ادب پر عبور رکھتا ہو، علومِ شریعہ کے کلیات و مقاصد سے اچھی طرح واقف ہو، قانونی ارتقائی تسلسل کے لیے سابقہ مجتہدینِ امت کے کاموں سے خوب واقف ہو، عملی زندگی کے معاملات و مسائل سے آگاہی کہ انھی پر اصول منطبق ہونا مطلوب ہیں، سیرت و کردار کے لحاظ سے قابلِ اعتبار ہو تاکہ عوام الناس اس کے اجتہاد پر بھروسا کر سکیں۔ مودودی کے نزدیک ان اوصاف کے ساتھ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ اجتہاد کیسے کیا جائے، لکھتے ہیں کہ

> "اجتہاد اور اس کی بنا پر ہونے والی قانون سازی کے مقبول ہونے کا انحصار جس طرح اس بات پر ہے کہ اجتہاد کرنے والوں میں اس کی اہلیت ہو' اسی طرح اس امر پر بھی ہے کہ یہ اجتہاد صحیح طریقے سے کیا جائے۔ مجتہد خواہ تعبیر احکام کر رہا ہو یا قیاس و استنباط' بہر حال اسے اپنے استدلال کی بنیاد قرآن اور سنت ہی پر رکھنی چاہیے۔۔۔ قرآن و سنت سے جو استدلال کیا جائے وہ لازماً ان طریقوں پر ہونا چاہیے جو اہلِ علم میں مسلّم ہیں۔"(۸)

سید مودودی اصولِ اجتہاد کو چند نکات میں یوں سمیٹتے ہیں کہ عربی زبان، اس کے قواعد، محاوروں اور ادبی نزاکتوں سے واقفیت کے ساتھ ساتھ قرآن اور اس کی آیات کے پس منظری معاملات و حالات کا گہرا علم، مختلف ادوار میں پیش آیندہ معاملات و مسائل کے لیے قوانینِ قرآن و سنت اور اجتہادی فیصلوں کے اطلاق کا علم اور اسلامی تاریخ میں ہونے والے اجتہاد و اجماع و قیاس کا علم ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے، کیوں کہ اس کے بغیر وہ اجتہاد کو اسلامی قوانین اور مقاصدِ قوانین کے مطابق نہیں کر سکتا۔(۹) شریعت کے احکام مبنی بر مصلحت ہیں، لہٰذا اجتہاد کرتے ہوئے یہ مد نظر رہنا چاہیے کہ اجتہاد اسلامی احکام کی حکمت و مصلحت کے منافی نہ ہو۔

سید مودودی معاملات و حالات کو باریک بینی سے سمجھتے ہوئے شورائی اجتہاد کا تصور بھی پیش کرتے ہیں اور اس کے نفاذ کے شدید خواہاں بھی تھے۔ شورائی اجتہاد سے ان کی مراد ایک ایسی مجلس یا کونسل کا قیام ہے جس میں فقہا و علما باہمی علمی و فہمی بحث و تمحیص کے ساتھ متفقہ رائے یا کثرتِ رائے سے معاملاتِ نو کے بارے میں اجتہادی فیصلے کریں۔ ایسی شورائی مجلسِ اجتہاد کے قیام کی ایک منفرد سکیم کو وہ یوں دیکھتے تھے:

> "ایسی کونسل ایک ریاست میں بھی بنائی جاسکتی ہے اور اس کو ایک دستوری حیثیت بھی دی جاسکتی ہے تاکہ اس کے فیصلے قانونی طاقت حاصل کرلیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی ایک کونسل کی حیثیت محض ایک

علمی کونسل کی ہو اور وہ علمی حیثیت سے اپنے فیصلے شائع کرے اوران فیصلوں سے رہ نمائی حاصل کر کے قانون ساز ادارے صحیح قانون بنائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمام دنیائے اسلام کی ایک مرکزی کونسل ایسی بنائی جائے کہ جو ساری دنیا کے مسلمانوں کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اجتہادات کرے۔ اِس علمی کونسل کو قائم کرنے میں اگر مسلمان کامیاب ہو جائیں تو یہ بڑی رحمت ثابت ہو گی۔ اس سے تمام مسلمانوں کو رہ نمائی حاصل ہو گی اور کسی وقت چل کر یہ بھی ممکن ہو گا کہ ساری مسلمان حکومتیں مل کر ایک ایسی کونسل کو دستوری حیثیت بھی دے دیں تا کہ اِس کے فیصلے تمام مسلمان حکومتوں میں قانون کی طاقت حاصل کر لیں۔"(۱۰)

سید مودودی نے اپنی کتاب خلافت وملوکیتاور دیگر تحاریر میں واضح کیا کہ اسلامی ریاست دراصل "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے اصول پر قایم ہوتی ہے۔ ایسی ریاست میں اجتہاد بنیادی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ یہی وہ واسطہ ہے جس کے ذریعے شریعت کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر نئے مسائل کا حل نکلتا ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلا اللہ تعالیٰ ہے اور پارلیمنٹ یا کسی بھی ادارے کو اس کے احکام کے خلاف قانون سازی کا اختیار نہیں۔ تاہم شریعت کے اصولی دائرے کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی اجتہاد کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ مودودی نے اجتہاد کی اساس کو ہمیشہ قرآن و سنت کے ساتھ جوڑے رکھا۔ اقبال کے تصورِ اجتہاد کی طرح وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اجتہاد کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کو مطلق آزادی دے دی جائے بل کہ یہ ہے کہ شریعت کے اصولوں کی روشنی میں بدلتے حالات اور معاملات کے لیے نئی راہیں تلاش کی جائیں۔ فیصلہ سازی کی آزادی جہاں معاصر پیش آیندہ مسائلِ نو کے حل کے لیے خوش آیند ہے وہیں یہ آزادی تفرقہ اور انتشار کا اندیشہ بھی ساتھ لاتی ہے۔ لہٰذا آزادی کا یہ نازک معاملہ بہت فراست اور فہم سے طے پانا چاہیے۔ مودودی اجتہاد کو محض "فقہی جزئیات میں اختلاف" کا نام دینا درست نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک ہمہ گیر عمل گردانتے ہیں جو معیشت، سیاست، معاشرت، تعلیم اور قانون کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔

سید مودودی کے مطابق اسلامی ریاست میں عملاً قانون سازی اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں کیوں کہ جا بہ جا ایسے معاملات اور حالات سے واسطہ پڑتا ہے جن کے لیے براہِ راست اصول قرآن و سنت میں موجود نہیں ہوتا۔ سودی نظام کے خاتمے، موجودہ بینکاری نظام کے اسلامی معاشی نظام سے تطابق کے لیے اجتہاد ناگزیر ہے۔ حقوقِ نسواں کی تفہیمِ صحیحہ، وراثتی معاملات کی درستی

اور عائلی اصول و قوانین میں نت نئے مسائل کو درست نہج پر حل کرنے کے لیے اجتہاد لازم ہے۔ نیز، جدید سیاسی اور بین الاقوامی تعلقات میں اسلامی قوانین اور حدود کے مطابق لائحہ عمل کی ترتیب میں بھی اجتہاد کی اہمیت و ضرورت مسلّم ہے۔

اگرچہ سید مودودی اقبال سے متاثر تھے لیکن ان کے اجتہاد کا تصور زیادہ "فقہی و ادارہ جاتی" ہے جب کہ اقبال کا تصور زیادہ "فلسفیانہ و پارلیمانی"۔ سید مودودی کے ہاں نصوص کی بالادستی اور فقہی استدلال غالب ہے، جب کہ اقبال کے ہاں اجتہاد کو زیادہ تخلیقی اور تجدیدی پہلو سے دیکھا گیا ہے۔

علامہ مودودی کا تصورِ اجتہاد مسلم سماج کے لیے ایک عملی اور مربوط خاکہ فراہم کرتا ہے۔ ان کے نزدیک اجتہاد کے بغیر اسلامی نظامِ حیات کا قیام ممکن نہیں۔ وہ اجتہاد کو محض علما کی علمی مشق نہیں بل کہ ایک اجتماعی ادارہ جاتی عمل سمجھتے ہیں، جو قرآن و سنت کی بالادستی میں رہتے ہوئے جدید دنیا کے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ مودودی کا یہ تصور بیسویں صدی کے مسلم احیائی فکر میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور آج بھی اسلامی ریاست، معیشت اور معاشرت کی تشکیل میں رہ نمائی فراہم کرتا ہے۔

علامہ اقبال اور سید مودودی کے تصوراتِ اجتہاد ایک دوسرے کے متمم ہیں۔ اقبال نے اجتہاد کے تصور کو فلسفیانہ اور فکری سطح پر زندہ کیا جب کہ مودودی نے اسے عملی، فقہی اور ادارہ جاتی قالب دیا۔ اقبال نے تصورِ اجتہاد کے ذریعے مسلم ذہن کو مغربی فکر کے ساتھ مکالمے کے قابل بنایا، جب کہ مودودی نے اجتہاد کو اسلامی ریاست کے نظامِ قانون میں نافذ کرنے کا خاکہ پیش کیا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر اقبال کا تصورِ اجتہاد "روح" ہے تو مودودی کا تصورِ اجتہاد اس کی "ساخت" ہے۔ دونوں کی فکری وراثت آج بھی اسلامی فکر کی تشکیلِ نو میں بنیادی رہ نمائی فراہم کرتی ہے۔

دونوں مفکرین تقلیدِ جامد کے سخت ناقد ہیں اور اجتہاد کو اسلامی معاشرے کی روح قرار دیتے ہیں۔ تاہم علامہ اقبال اجتہاد کو زیادہ آزاد اور تخلیقی دائرے میں دیکھتے ہیں، جب کہ سید مودودی اسے قرآن و سنت کی قطعی حدود کے اندر ایک منظم اور محتاط عمل سمجھتے ہیں۔ اقبال کا زور زیادہ تر فکری و فلسفیانہ احیا پر ہے، جب کہ مودودی کا زور زیادہ تر ریاستی و قانونی تشکیل پر ہے۔ آج کے مسلم سماج کے لیے دونوں کے نظریات اہمیت رکھتے ہیں۔ اقبال کا اجتہادی وژن جدید دنیا کے فکری چیلنجز سے نمٹنے کے لیے رہ نمائی فراہم کرتا ہے، جب کہ مودودی کا ادارہ جاتی تصور مسلم ریاستوں کے قانونی و عملی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ امینی، محمد تقی، مسئلۂ اجتہاد پر تحقیقی نظر، دہلی: کوہِ نور پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۲ء، ۱۴۔

۲۔ فاروقی، محمد یوسف، اجتہاد – مناہج و اسالیب، اسلام آباد: شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، ۲۰۰۹ء، ۱۱۔

۳۔اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ، لاہور: بزمِ اقبال،۱۹۵۸ء،۲۲۸۔
۴۔اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ،۲۲۸۔
۵۔ایضاً،۲۲۳۔
۶۔ایضاً،۲۲۷،۲۲۸۔
۷۔مودودی، ابوالاعلیٰ، تنقیحات، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۱۹۶۴ء،۱۹۔
۸۔مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیمات–سوم، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز،۱۹۶۹ء،۱۱–۱۳۔
۹۔مودودی، ابوالاعلیٰ، تفہیمات–سوم،۳۱۔
۱۰۔مودودی، ابوالاعلیٰ، مولانا مودودی کے انٹرویو، مرتبہ ابو طارق، دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ۱۹۹۴ء،
۳۵،۳۴۔